مایہ ناز مصنفہ کی ایک شہکار تحریر

مژدۂ آب

نگہت سیما

طویل مکمل ناول

خواتین ڈائجسٹ دسمبر 1990ء

Imagitor

CamScanner

KSK Novels

نگہت سیما

مژدہ

ایمی کہتی ہے میں اُن کا اعتبار کیوں نہیں کرتا۔
میں محبتوں سے اتنا متنفر کیوں ہوں۔
رضا کو بھی مجھ سے یہی شکایت ہے۔
"یار! دوستوں پر اعتبار کرنا سیکھو۔"
بارہا اُس نے مجھ سے کہا ہے۔
"میں تمہارا دوست ہوں علی! اپنے دُکھ میرے ساتھ شیئر کرو۔ پتا نہیں ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو۔ اپنے دل کی بات مجھے بتاؤ علی شاید میں تمہارے کام آسکوں۔"
اور جب وہ اپنے بے تحاشا خلوص کا اظہار کرتا ہے۔ تو میں اور چڑ جاتا ہوں۔ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ اور میں اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلا آتا ہوں، وہ حیران آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا میرے پیچھے لپکتا ہے۔
"علی! علی یار! رکو تو بھئی ایک دم کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ایمی کافی بنانے گئی ہے، یار کافی تو پی کے جاؤ نا۔"
"نہیں۔" میں اُس کی طرف دیکھے بغیر کہتا ہوں۔
"مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔"
حالانکہ مجھے کوئی کام نہیں ہوتا اور میں یونہی گھنٹوں بے مقصد ٹہلتا رہتا ہوں غصہ، بیزاری اور جھنجلاہٹ میرے اندر بل کھاتی رہتی ہے۔ میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر سرمئی شفاف سڑک پر زور زور سے پاؤں مارتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔
"آخر آخر یہ رضا اور ایمی کیوں۔ کیوں مجھ پر اتنی محبتیں لٹاتے ہیں؟"
"پلیز رضا۔ اور ایمی۔"
میں دل ہی دل میں اُن سے التجائیں کرتا ہوں۔
"مجھ سے اتنا خلوص مت برتو۔ اتنی محبت مت لٹاؤ مجھ پر کہ میں تمہیں کھو دوں۔ تم سے دور ہو جاؤں۔"
اور ساری بات یہ ہے کہ میں اُنہیں کھونا نہیں چاہتا۔ شاید میں تنہا رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔ مجھے اُن کی رفاقت اور دوستی کی ضرورت ہے۔ اُن کے پاس جا کر مجھے عجیب سا سکون ملتا ہے، لیکن جب وہ اپنی محبتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنا خلوص بے دریغ مجھ پر لٹاتے ہیں تو اُن کا یہ حد سے بڑھا ہوا التفات مجھے پاگل سا کر دیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابھی لمحوں میں اُن کے چہروں سے نقاب اُتر جائے گا اور پھر، پھر ایک اذیت ناک جدائی۔ ایک طویل کبھی نہ ختم ہونے ہونے والی اذیت میری رگوں کو کاٹنے لگتی ہے۔ اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو توڑتا چلا جاؤں۔ اور سرمئی سڑک کو اپنے قدموں تلے روند کر، تھک کر میں گھر آتا ہوں اور اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو پاؤں سے ٹھوکریں مارتا جب میں اپنے بیڈ پر گرتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے خوب چیخ چیخ کر روؤں زور زور سے اور وہ آنسو جو آج سے برسوں پہلے حیرت، دُکھ اور غم کی زیادتی سے میرے اندر ہی اندر خشک ہو گئے تھے، میرے اندر ہلچل مچا دیتے ہیں۔ لیکن میں روتا نہیں ہوں اور تکیے کو، کشنوں کو، بیڈ کی چادروں کو اٹھا اٹھا کر پھینک دیتا ہوں۔
پھر بھی غصہ میرے اندر بل کھاتا رہتا ہے۔ اور میں، میرا دل چاہتا رہتا ہے کہ یونہی اسی طرح اُٹھ کر رضا کے پاس جاؤں اور پھر ہاتھ جوڑ کر اُس سے درخواست کروں۔
"رضا گیلانی اور ایمن گیلانی مجھ سے اتنا خصوصی برتاؤ نہ کرو۔ ورنہ۔ ورنہ میں۔"
اور پھر صبح تک میرا غصہ قدرے کم ہو جاتا ہے تو میں آفس میں چور نظروں سے رضا کی طرف دیکھتا ہوں، جو منہ پھلائے بیٹھا ہوتا ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے خفا ہو گیا ہوگا۔ روٹھا ہوگا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اُٹھ کر اُسے منا لوں۔ معذرت کر لوں۔ مجھے پتا ہوتا ہے کہ میرے ایک ذرا سے سوری کرنے سے وہ خوش ہو جائے گا اور میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہے گا۔
"یار تم بھی عجیب آدمی ہو۔ میں، ایمی اور ماما ہم سب تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ کس قدر محبت کرتے ہیں تم سے۔"
اور یہی تو میں نہیں سننا چاہتا۔ اس لیے چپ بیٹھا چور نظروں سے اُسے دیکھتا رہتا ہوں۔ کتراتا رہتا ہوں۔ میری

CamScanner

آنکھوں کے سامنے روحی کا چہرہ آجاتا ہے اور پھر یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ چیر رہا ہو۔ اذیت سے میری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اور رضا بے چارہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ بیٹھے بیٹھے یکدم مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ اور میں کیسے بتاؤں اُسے کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ دنیا نے لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا۔ کیسے میرے دل پر کاری وار کیے، گہرے زخم کیسے لگائے۔ کیسے مجھے مار ڈالا۔ اور میں کیوں اتنے سالوں سے محبتوں سے بھاگ رہا ہوں۔ خلوص و چاہت سے دامن چھڑاتا ہوں۔

ہمایوں، وقار طاہر اور فخر کتنے سارے اچھے اچھے

دوستوں کو میں نے چھوڑ دیا تھا۔ محض اس لیے کہ اُن کی محبتوں اور خلوص سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے ابھی وہ اپنا اصل ظاہر کر کے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

اور میں رضا کو کیسے سمجھاؤں کہ کتنا زہریلا اثر ہوتا ہے۔ نارِ افعی کے ڈسنے کا۔

اور میں نے سوچا تھا کہ کبھی کسی کے اتنا قریب نہیں جاؤں گا کہ لوٹنے کا خدشہ ہو، جبھی تو میں اس دور دراز قصبے میں ٹرانسفر کروا کے خوش تھا کہ میں فخر و وقار اور ہمالیوں کی محبتوں کے جال سے نکل آیا ہوں۔ لیکن پتا نہیں یہ رضا اور ایمن کب اور کیسے میرے قریب آ گئے ہیں۔

میں جتنا ان سے بھاگتا ہوں یہ اتنا ہی میری طرف لپکتے ہیں، میں ان کی محبتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا۔ ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں، لیکن میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ شاید میں ان کی محبتوں کا اسیر ہوتا جا رہا ہوں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی برسوں پہلے جو عہد میں نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ وہ عہد مجھے ٹوٹتا ہوا سا دکھائی دیتا ہے، اور یہ بے بسی مجھے جھنجلائے رکھتی ہے۔ رضا ہمیشہ خود ہی مجھے منا لیتا ہے، بالکل پہلے جیسا جیسے میں نے اس کے ساتھ کوئی، بدتمیزی نہیں کی تھی۔

"یار اجلی نا ماما یاد کر رہی تھیں اور وہ امی بھی تمہیں پوچھ رہی تھی۔"

میں اندر ہی اندر نادم ہو جاتا ہوں۔

امی جس کی بنی ہوئی کافی پیے بغیر میں بھاگ آیا تھا۔

اور ماما۔ جن کو میں سلام تک کرنے کے لیے نہیں گیا تھا۔

اور پھر میں سر جھکائے نادم نادم سا رضا کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔

اور پھر کبھی کوئی ایسی ہی بات ہو جاتی ہے۔

مگر اب۔ اب شاید رضا اور امی مجھے کبھی نہ سنائیں۔

اب شاید میں نے انہیں بہت زیادہ خفا کر دیا ہے۔ بہت ہی زیادہ۔

میں تین دن سے آفس نہیں جا رہا تھا کیونکہ مجھے بخار تھا۔ اور جب رضا میری مسلسل غیر حاضری کی خبر لینے آیا تو مجھے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"اتنا تیز بخار۔ ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"نہیں۔"

اُسے اتنی اپنائیت سے اپنا احوال پوچھتے دیکھ کر مجھے بڑی طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔

"انتہائی احمق ہو یار، تم نے اطلاع ہی بھجوا دی ہوتی، اکیلے بخار میں پڑے ہو، وہ شیر زمان کدھر ہے؟"

"یہیں کہیں ہوگا۔"

"شیر زمان! شیر زمان۔"

وہ زور زور سے چلانے لگا۔

"صاحب کے لیے دوا نہیں لائے، کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔"

"جی وہ صاحب نے منع کر دیا تھا۔"

"صاحب کا تو دماغ خراب ہے۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ڈاکٹر کو لا رہا ہوں۔"

اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ ڈاکٹر کو لے آیا۔ اور پھر بڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتا رہا۔ اور جب ذرا بخار کم ہوا تو وہ جا کر ماما اور امی کو لے آیا۔ ماما نے مجھے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔

"تم ہمیں غیر سمجھتے ہو علی۔ اطلاع تک نہیں دی۔"

"اتنی غیریت علی بھائی۔"

ایمن نے بھی شکوہ کیا۔

ماما روتے ہوئے میری پیشانی دبانے لگیں۔ اور امی کچن میں گھس گئیں، اور تھوڑی دیر بعد سوپ بنا کر لے آئیں اور رضا نے زبردستی مجھے سوپ پلایا۔

"علی! تمہارا گھر بہت گندہ ہو رہا ہے۔ یہ شیر زمان کچھ نہیں کرتا کیا؟"

ماما نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔

"بس یوں ہی۔"

میں اب کیا کہتا کہ میں خود ہی کوئی دلچسپی نہیں لیتا تو، شیر زمان کو کیا پڑی ہے کہ تھکتا رہے۔

"امی بیٹا! تم صبح آ کر خورشید زمان سے۔ صفائی کروانا تو فرنیچر پر چھ چھ انچ مٹی کی تہیں جمی ہیں۔"

پھر ماما اور امی چلی گئیں۔ اور رضا زبردستی میرے پاس رک گیا۔ رات جب بھی میری آنکھ کھلتی، اُسے کرسی پر بیٹھا پاتا۔ اس کا یہ خلوص مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ بے چینی سی لگی تھی۔

اس پر صبح ہی صبح امی آ گئیں۔ اور شیر زمان کے ساتھ مل کر اس نے پورے گھر کو چمکا دیا۔ اور جب وہ میرے کمرے میں آ کر

بکھری ہوئی چیزیں اِدھر اُدھر سنبھالنے لگی تو میں اندر ہی اندر اُلجھنے لگا۔ وہ چیزیں اِدھر اُدھر ترتیب سے رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ بڑی اپنائیت اور محبت سے جیسے وہ برسوں سے مجھے جانتی ہو جیسا میرا اور اُس کا کوئی بہت پرانا رشتہ ہو۔ کوئی بلڈ ریلیشن ہو یا کوئی محبت کا ناتا۔

"اللہ! علی یہ دیکھیں وارڈ روب میں کپڑے کیسے رکھے ہیں۔ گولے بنا بنا کر۔" وہ میری ایک شرٹ ہاتھ میں پکڑے میری طرف مڑی تو جانے مجھے اُس کی آنکھوں میں کیا نظر آیا۔ کہ میں ایک دم ہیجان پڑا۔

"مت کرو مجھ پر یہ مہربانیاں۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ نہیں ہو سکتا میں ان محبتوں کا متحمل۔ چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔ نہیں چاہیے مجھے تمہارا یہ خلوص۔ نفرت ہے مجھے ان جھوٹی محبتوں سے۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتی رہی تھی۔

"بی۔ ایزی علی!" رضا نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں ہوا مجھے۔" میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"لیکن خدا کے لیے تم میرا پیچھا چھوڑ دو رضا۔ مت لُٹاؤ یہ محبتیں۔ مت فریب دو مجھے۔ ان محبتوں اور چاہتوں کا۔ صاف صاف کہہ دو بتا دو کہ کیا مطلب ہے تمہیں مجھ سے، کیا مفاد وابستہ ہے، تمہارا مجھ سے، کیا چاہتے ہو جو کچھ لینا ہے لے لو۔ یہ رہی میری چیک بک۔ اس کے ہر صفحے پر میرے دستخط موجود ہیں جتنی چاہیے رقم لکھ لو۔ لیکن مجھے اس طرح محبتوں کا فریب دے کر مت لوٹو۔ اس طرح خلوص کا لبادہ اوڑھ کر مجھے۔"

میں نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔

دونوں ساکت کھڑے تھے اور ایمن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ میری شرٹ اُس کے ہاتھوں سے گر گئی تھی۔ پھر بنا کچھ بولے، بنا کچھ کہے رضا نے ایمن کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گیا۔ اور اُن کے جاتے ہی میرا دل پگھلنے لگا۔ میں تکیے میں منہ چھپا کر ہولے ہولے سسکنے لگا۔

"ہاں مت لوٹو۔ مت لوٹو مجھے محبتوں کا فریب دے اور یہ کل ہی کی تو بات ہے۔ ٹھیک اسی وقت وہ دونوں خفا ہو کر چلے گئے تھے، پورے چوبیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اور رضا پلٹ کر نہیں آیا۔ حالانکہ اُسے پتا بھی ہے مجھے بہت تیز بخار ہے۔ مگر اب بھلا وہ کیسے آ سکتا ہے۔ میں نے۔ میں نے خود ہی تو۔ اور روحی بیگم میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا کبھی نہیں۔ تم نے اتنی کم عمری میں میرا شیشہ چکنا چور کیا ہے کہ اب اُس میں کوئی تصویر ٹھہرتی ہی نہیں۔ تم نے اس طرح میرے اعتماد کو کرچی کرچی کیا ہے کہ اب کسی پر اعتبار قائم ہی نہیں ہوتا۔

تم نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا روحی نثار احمد۔

کاش! تمہارا چہرہ یونہی دبیز نقابوں تلے چھپا رہتا۔

کاش! میں زندگی بھر اس فریب میں رہتا کہ تمہاری محبت بے لوث اور بے غرض ہے۔

کاش! اے کاش تم نے سچ مچ مجھے چاہا ہوتا۔

اسی طرح جیسے تم کہا کرتی تھیں۔ ایک بھائی کی طرح ایک دوست کی طرح۔

کاش! تمہاری محبت میں رتی بھر ہی حقیقت ہوتی۔

اور تم نے میری بے تحاشا محبتوں اور چاہتوں کے جواب میں مجھ سے رتی بھر ہی محبت کی ہوتی۔

لیکن تمہارا وجود تو دھوکے اور فریب سے بنا تھا۔

آج بھی۔ برسوں گزر جانے کے بعد، ساری حقیقت پا لینے کے بعد۔

اور سب کچھ اپنے کانوں سے سننے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سب کچھ فریب تھا۔ دھوکا تھا۔ وہ ساری محبتیں، وہ ساری مہربانیاں جھوٹ تھیں۔ کیا کوئی اس طرح بھی جھوٹ بول سکتا ہے؟

اور کیا آنسو بھی جھوٹے ہوتے ہیں۔؟

وہ آنسو جو تم نے میرے ساتھ مل کر بہائے۔

اور جب میں ان آنسوؤں کا سوچتا ہوں تو میرا یقین ڈگمگانے لگتا ہے۔ جیسے میرے کانوں نے غلط سنا ہو، جیسے میری سماعتوں نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ لیکن نہیں میری آنکھیں تو اندھی نہیں تھیں اور جب میں گئے ماہ و سال کے سارے سود و زیاں کا حساب لگاتا ہوں۔ تو تمہارے آنسو جھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے۔

"ہاں علی سردار! کبھی کبھی آنسو بھی جھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اتنے مکار ہوتے ہیں کہ اُن کا ہر عمل جھوٹ ہوتا ہے روحی نثار احمد تمہاری طرح۔

اور اے کاش! تم نے مجھے اس طرح محبتوں کا امرت پلا کر نہ لوٹا ہوتا تو آج میں رضا اور ایمی جیسے دوستوں کو

ناراض نہ کرتا۔ کیا پتا رضا اور امی بھی ردی جیسے ہوں۔ اُسی کے جیسے فریبی۔ مجھ سے محبتیں جتا کر میرے لیے پریشان ہو کر مجھے توڑنا چاہتے ہوں اور جب میں ٹوٹ جاؤں، اُن کی محبت میں پور پور ڈوب جاؤں تو وہ ایک دم اپنے چہرے سے نقاب نوچ ڈالیں۔ اور اُن کا اصل چہرہ دیکھ کر میرا دل میرا دل۔

اور میں اپنے ڈوبتے دل کو سنبھالے کھڑکی میں آ کھڑا ہوا ہوں۔ اگرچہ بخار کی وجہ سے میں کھڑا نہیں ہو پا رہا ہوں، لیکن میں پھر بھی کھڑا باہر سڑک پر دیکھ رہا ہوں کہ شاید دور کہیں رضا آتا دکھائی دے جائے یا پھر امی پورے چوبیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔

اور رضا کو پتا تھا کہ میں بیمار ہوں۔

پھر۔ پھر بھی وہ نہیں آیا۔

شاید میں نے کچھ زیادہ ہی تلخ باتیں کہہ دی تھیں۔

آج۔ آج اگر رضا آ گیا تو میں اُسے بتا دوں گا کہ میں اُن کا اعتبار کیوں نہیں کرتا۔

محبتوں سے متنفر کیوں ہوں۔

ہاں، آج برسوں بعد میں اپنے دل پر دھرے بوجھ کو اُتار پھینکوں گا۔

پر رضا۔ رضا کیوں آئے گا؟

اداسی میرے اندر کہرے کی طرح گرنے لگی ہے اور میں ہولے ہولے چلتا ہوا بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ اور بیتے ہوئے ماہ و سال میری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے ہیں۔

وہ دن مجھے کبھی نہیں بھولتا جب میرے دل نے داد کا ایک نیا ذائقہ چکھا تھا۔ دانی کے ساتھ مری کانونٹ کے پرائمری حصے کی طرف جاتے ہوئے سسٹر میری نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

"ہیلو، ینگ بوائے کیسے ہو؟"

"فائن!" سسٹر میری پرائمری حصے سے منسلک تھیں اور میری بہت فیورٹ ٹیچر تھیں۔

"یہ؟" سسٹر میری نے دانی کی طرف اشارا کیا۔

"مائی برادر۔" میں نے فخر سے اُس کی طرف دیکھا۔

"بہت کیوٹ ہے بالکل تمہاری طرح۔"

"بٹ سیڈ برادر۔" (لیکن سوتیلا بھائی)

دانی نے سر اُٹھا کر عجیب سے انداز میں کہا تو میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میرا رنگ یکدم زرد پڑ گیا۔ اور ہاتھ میں پکڑا ہوا دانی کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

دانی مجھ سے تین برس چھوٹا تھا۔ دانی فور میں تھا اور میں سیونتھ میں۔ لیکن آج سے پہلے مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے۔ دانی سے چھوٹا راحیل دونوں ہی مجھے بہت عزیز تھے۔ سسٹر میری نے میرے کندھے کو ہولے سے تھپتھپایا۔

"ٹیک اٹ ایزی بوائے، ٹیکٹ از ٹیکٹ۔"

لیکن یہ کیسی حقیقت تھی جس نے میرے ننھے سے دل میں عجیب سا درد بھر دیا تھا۔ میں جو بہت خوش خوش دانی کے ساتھ اُس کے کمرے میں جا رہا تھا۔ وہیں سے واپس پلٹ آیا۔

اُس رات میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اور بہت دیر تک سوچتا رہا کہ دانی اور راحی میرے سوتیلے بھائی کیوں ہیں۔ اور وہ میرے سگے بھائی کیوں نہیں ہیں۔ اور دانی نے ایسا کیوں کہا کہ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے، اُس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ وہ میرا بھائی ہے صرف بھائی۔ میں نے تو کبھی کسی سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے۔ پھر اُس کے دل میں یہ زہر کس نے بھرا۔؟

ممی نے یا ڈیڈی نے۔؟

ممی کا رویہ ہمیشہ میرے ساتھ نارمل ہی رہا تھا۔ نہ بہت زیادہ محبت نہ کوئی دشمنی وہ ہمیشہ مجھ سے لاتعلق سی رہی تھیں اور انہوں نے کبھی میرے معاملات میں دخل بھی نہیں دیا تھا۔ ممی کی وفات کے بعد دو سال تک میں دادی کے پاس رہا تھا اور دادی کی وفات کے بعد ڈیڈی مجھے گاؤں سے لے آئے تھے اور مجھے مری میں داخل کرا دیا تھا۔

چھٹیوں میں گھر جاتا تھا تو زیادہ تر ڈیڈی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ پھر دانی اور راحی آ گئے۔ میں اُن کے ساتھ مصروف رہتا تھا پھر دانی کو بھی ڈیڈی نے مری میں داخل کرا دیا یوں پانچ سال سے وہ اور دو سال سے راحی بھی مری میں تھے۔ میں نے کبھی ممی کے رویے پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اتنے سارے سالوں بعد میں سوچ رہا تھا کہ ممی نے تو بطور خاص کبھی مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میرے کپڑے نوکر استری کر دیتا تھا۔ میرے کمرے کی صفائی ہو جاتی تھی۔ کھانا سب کے ساتھ ٹیبل پر کھا لیتا تھا۔ ممی سے اسلام علیکم وعلیکم سلام کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی، جبکہ دانی اور راحی تو ممی سے بہت باتیں کرتے تھے۔ اپنے اسکول کی اور اپنے فرینڈز کی

اور ممی بھی اُن سے کرید کرید کر پوچھا کرتی تھیں۔ اُن کی تعلیمی رپورٹ پر خوشی کا اظہار کرتی تھیں بلکہ میری تعلیمی رپورٹ پر ڈیڈی خاموشی سے سائن کر دیتے تھے نہ کوئی تبصرہ نہ کوئی تعریف۔ مگر میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا اس سب کے بارے میں۔ مگر آج اس سے مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں تو بالکل اکیلا ہوں میرا کوئی نہیں۔ میری خوشیوں پر خوش ہونے والا اور میرے دکھوں پر رونے والا نہ کوئی بھائی نہ بہن نہ ممی اور شاید ڈیڈی بھی نہیں۔

ہاں ڈیڈی بھی میرے نہیں ہیں۔ وہ صرف دانی اور راحی کے ڈیڈی ہیں۔ میں تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اندر ہی اندر میرے دل کو چھیل رہا ہو۔ میں پتا نہیں کب تک روتا رہا اور یونہی روتے روتے سو گیا۔ مگر اُس روز سے اکیلے پن اور تنہائی کا جو احساس میرے اندر سے ابھرا تھا وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔

ہر آنے والا دن میرے دکھ اور اذیت میں اضافہ کرتا رہا۔ میں گم گو اور خاموش ہوتا جا رہا تھا۔ میں چھٹیوں میں گھر جاتا تو ممی کی ایک ایک بات پر غور کرتا۔ ممی دانی اور راحی سے جس بے چینی سے ملتی تھیں، جس طرح اُن کے رخساروں اور ماتھے پر بوسے دیتی تھیں۔ جس طرح اُن کی خاطر مدارات کرتی تھیں۔ وہ سب میرے دل پر زخم لگاتا۔ گہرے اور تکلیف دہ زخم۔

"میرا کوئی نہیں" آنسو قطرہ قطرہ میرے اندر گرتے۔

"میری ممی ہوتیں میری اپنی سگی ماں تو مجھ سے بھی یوں والہانہ انداز میں ملتیں۔ ایسی ہی بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کرتیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبھی دودھ کبھی فروٹ لے کر آتیں۔ میں ذرا چپ ہوتا تو اداس ہو جاتیں۔ مگر وہ تو بالکل اجنبی لگتی تھیں۔

"کیسے ہو علی؟" وہ پوچھتیں۔

"ٹھیک ہوں ممی!" میں آہستگی سے کہتا۔

وہ رسمی سے انداز میں میری پیشانی پر بوسہ دیتیں۔ اور بس اندر ہی اندر میرا دل مچلتا رہتا۔ کہ وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کریں جتنا وہ دانی اور راحی سے کرتی ہیں۔ مگر محبتیں بھلا یوں چاہنے سے ملتی ہیں؟

ایک ڈیڈی تھے میرے اپنے مگر وہ اتنے مصروف رہتے تھے کہ اُن کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ بس رات کھانے پر میلو میلو ہو جاتی اور کبھی کبھی راحی وغیرہ ضد کرتے تو رات کا کھانا باہر کھا لیا جاتا۔ ایسے میں کبھی کبھی راستے میں ڈیڈی کوئی بات کر لیتے یوں ہی پڑھائی کے متعلق یا ہوسٹل کے متعلق۔

اور میں بس یہ چاہتا تھا کہ ڈیڈی مجھے خصوصی توجہ دیں۔ وہ محبت بھی مجھے دیں جو ممی مجھے نہیں دے رہی تھیں مگر میں یہ سب کچھ ڈیڈی سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ سو اداس بیٹھا سوچتا رہتا تھا۔

یونہی اِدھر اُدھر کی لایعنی باتیں۔

پڑھائی کی طرف سے میرا دھیان ہٹ گیا تھا۔ بس ہر وقت سوچتا رہتا کوئی ہو جو مجھے چاہے، مجھ سے محبت کرے، میری ضرورتوں کا خیال رکھے میرے لیے پریشان ہو، میرے سر میں درد بھی ہو تو وہ بے چین ہو جائے۔

اسکول میں میرے کئی دوست تھے، مگر وہ میرے ہم عمر تھے اور میری اس جذباتی خواہش کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ میں اُن سے روٹھتا تو وہ مجھے نہ مناتے۔ میرا دل چاہتا تھا وہ مجھے منائیں مجھ سے اتنی ہی محبت کریں جتنی میں اُن سے کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میں کتاب سامنے رکھے بیٹھا رہتا۔ میرا رزلٹ کافی خراب تھا۔ ڈیڈی نے مجھے ڈانٹا۔

"یہ کیا ہے علی؟" میں سر جھکائے کھڑا رہا۔

"تم جانتے ہو تمہاری تعلیم پر سالانہ کتنا خرچ ہوتا ہے؟"

میں کیا کہتا۔ خاموش رہا۔

"اور تم یہ سب ضائع کرنا چاہتے ہو؟"

"دیکھو علی! میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور میری خواہش تھی کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ میں نے تمہیں اچھے اسکولوں میں داخل کروایا۔ اپنی محنت کی کمائی تم پر اس لیے خرچ کر رہا ہوں کہ تم اسے ضائع کر دو؟"

اور میں نے ڈیڈی سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ پڑھائی کی طرف پوری توجہ دوں گا۔ لیکن میں اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکا۔ ڈیڈی تین سال کے لیے اپنی کمپنی کی طرف سے سعودی عرب چلے گئے۔ اور ممی کا رویہ ایکدم بدل گیا۔ وہ اب بالکل سوتیلی ماں لگنے لگی تھیں۔ بات بے بات ٹوکنا۔ اگر کوئی نیا ملنے والا کہتا۔

"علی پیارا بچہ ہے۔ بہت خوبصورت اور سلجھا ہوا۔"

تو اُن کی رنگت بدل جاتی وہ چاہتی تھیں کہ سب لوگ دانی اور راحی کی تعریف کریں۔

"ارے نہیں علی تو بہت بدتمیز ہے بہت نالائق۔ پتا نہیں وہاں مری میں کن لڑکوں کی صحبت اسے ملی ہوئی ہے کہ بہت بگڑ گیا ہے۔ اُس کے ڈیڈی تو بہت پریشان رہتے ہیں۔ اتنی خراب رپورٹ آئی ہے اسکول سے۔"

اور میں حیرت سے اُن کی باتیں سُنا کرتا۔ ممی کتنی خوبصورتی سے جھوٹ بولتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ میرا رزلٹ پہلے کے مقابلے میں اچھا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی کلاس میں میری گیارہویں پوزیشن تھی اور میں اپنی پوزیشن بحال کرنے کے لیے پوری کوشش کر رہا تھا اور ماہانہ ٹیسٹوں میں اچھے نمبر آ رہے تھے۔

ممی کی باتیں میرے دل میں زخم کر دیتیں۔ اُداسی میرے اندر اترنے لگتی۔ ممی واضح طور پر مجھ سے نفرت کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ بارہا انہوں نے میرے سامنے اپنے ملنے والوں سے کہا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں اور اس نفرت کے بیج وہ دانی اور رامی کے دل میں بھی بو رہی تھیں۔

دانی اور رامی جو صرف میرے بھائی تھے۔

مگر ممی نے اُن کے دل میں سوتیلے پن کا زہر بھر دیا تھا۔

دانی مجھ سے بدتمیزی کرنے لگا تھا۔

اور رامی بھی اُس کے نقشِ قدم چلتا تھا۔

دونوں کے اندر ممی کی زبان بولتی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا قصور کیا ہے۔

اُس روز بھی لان میں چپ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میرا قصور کیا ہے۔ اگر میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے تو کیا میں ساری زندگی محبتوں سے ناآشنا رہوں گا۔ کیا اس بھری دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ جس کی گود میں سر رکھ کر میں رو سکوں۔ اور جسے میں بتا سکوں کہ میرے اندر کتنی محرومیاں پل رہی ہیں اور میرا دامن کتنا تہی ہے۔ میں جو لارنس کالج گھوڑا گلی میں پڑھتا ہوں۔

اچھے کپڑے پہنتا ہوں۔

ایک شاندار گھر میں رہتا ہوں جس میں زندگی کی ساری سہولتیں موجود ہیں۔

اور گاؤں میں رہنے والے میرے رشتہ دار مجھے رشک سے دیکھتے ہیں۔

لیکن کون جانے میں اُنہیں کتنے رشک سے دیکھتا ہوں کتنی حسرت ہے میرے دل میں کہ کاش میں اُن جیسا ہوتا۔ چھوٹے سے گاؤں کے کسی چھوٹے سے گھر میں رہتا اور مجھے ماں کی باپ کی اور بہن بھائیوں کی بھرپور محبتیں حاصل ہوتیں۔ بلا سے میں کسی چھوٹے سے اسکول میں تعلیم حاصل کرتا لیکن میں بہت پُرسکون اور مطمئن ہوتا۔

اور اب میں اس بڑے سے گھر میں رہ کر بھی مطمئن نہیں ہوں۔ آج ممی نے ذرا سی بات پر میری کتنی بے عزتی کر ڈالی تھی، حالانکہ غلطی سراسر دانی کی تھی مگر ممی ہمیشہ دانی کی بے جا حمایت کرتی تھیں اور جب سے ڈیڈی گئے تھے، تب سے تو وہ کھل کر ایسا کرنے لگی تھیں۔ میرا جیب خرچ بھی انہوں نے کم کر دیا تھا۔ جبکہ دانی کو جتنا ضرورت ہوتا دیتیں۔ اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں ممی سے لڑوں احتجاج کروں مگر میں چپ کر جاتا اور اندر ہی اندر یہ دُکھ مجھے کھائے جاتا تھا۔

ممی کی ڈانٹ سُن کر میں لان میں چپ آ کر بیٹھ گیا تھا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں مگر میں انہیں بہنے نہیں دے رہا تھا۔ غصے سے میں نے زمین پر زور سے ہاتھ مارا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہوا سے لڑ رہے ہو کیا؟"

میں نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی تھی۔ اور نہ جانے کب میری بے خبری میں میرے پاس آ گئی تھی۔

"آپ کون ہیں؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ مجھے اس کی بے تکلفی پر حیرت ہو رہی تھی۔

"میں" وہ مسکرائی۔

"روحی ہوں اِدھر پیچھے والے گھر میں رہتی ہوں۔ تم دانی ہو؟"

"نہیں" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں علی ہوں"

"اچھا تو آپ علی ہیں"

اُس نے بہت غور سے میرا جائزہ لیا۔

"بہت ذکر سُنا ہے تمہارا"

میں جانتا تھا کہ اُس نے کیا سُنا ہوگا۔ اس لیے غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"ممی گھر پر نہیں ہیں"

"کوئی بات نہیں مجھے تو تم سے ہی ملنے کا شوق تھا"

وہ میرے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے؟" میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"ہاں بھئی تم سے۔ آنٹی نے اتنا کچھ تمہارے متعلق بتایا ہے کہ اشتیاق تھا کہ دیکھیں مگر تم تو بھئی آنٹی کی بتائی

ہوئی شخصیت سے کچھ مختلف شخصیت نظر آرہے ہو۔"

اُس روز ممی نے اپنی بہنوں کے سامنے میری بہت انسلٹ کی تھی۔ شاید میرا دل اندر سے بہت دُکھا ہوا تھا۔ یوں جیسا بھرا ہوا، ذرا سی ٹھیس سے پھٹ پڑتا ہے میں بھی پھٹ پڑا۔

"جی نہیں جو کچھ آپ کی آنٹی نے آپ کو بتایا ہے بالکل صحیح بتایا ہوگا۔ میں اس سے کہیں زیادہ بُرا ہوں جتنا آپ کو بتایا گیا ہے۔ میرا تعلیمی ریکارڈ بہت خراب ہے۔ میں بہت بدتمیز ہوں اور بُرے لڑکوں سے میری دوستی ہے اور یہ کہ آپ میری معصوم شکل پر نہ جائیں۔"

"ارے ارے تمہارے منہ میں تو آنٹی کی زبان بول رہی ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں تم بہت اچھے اور پیارے لڑکے ہو۔ ہے نا۔ پیارے ہو نا؟"

میں کھڑا ہو گیا۔

"ممی پڑوس میں ہیں، شاید ابھی آ جائیں گی۔"

"ارے یار! بیٹھو نا۔"

اُس نے میرا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے پکڑ کر مجھے بٹھا لیا۔ جیسے برسوں سے مجھے جانتی ہو۔

"آنٹی تمہاری سوتیلی ماں ہیں نا؟"

"پتا نہیں۔"

میری آنکھیں جل تھل ہونے لگیں۔ میں نے پوری کوشش سے اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس لفظ سوتیلی سے اتنی چڑ تھی میرا بس چلتا تو میں اس لفظ کو لغت سے ہی مٹا ڈالتا۔ جب کوئی کہتا تھا کہ تمہاری سوتیلی ممی تمہارے سوتیلے بھائی تو میرے اندر کچھ ہونے لگتا تھا۔ محرومیاں مجھے بچھو کے لگاتیں جیسے میں بالکل اکیلا اور تنہا ہوں۔

"علی! سوتیلی ماں کبھی سگی ماں نہیں بن سکتی پھر تم کیوں محسوس کرتے ہو ان کی باتوں کو؟"

پتا نہیں اس روز میں ہی اتنا دلگرفتہ ہو رہا تھا یا روحی میں ہی کوئی ایسی بات تھی کہ میں نے اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ کسی سے پہلی بار میں نے اپنے دل کی باتیں کی تھیں، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پچھلے دو سالوں سے میرے دل پر دُکھ کا جو غبار جم ہو گیا تھا وہ ہلکا ہو گیا ہے۔ میں نے اُس شام سے رجب سسٹر میری سے دانی نے کہا تھا لیکن سوتیلا بھائی، لے کر اب تک کی ایک ایک بات روحی سے کہہ دی اور روحی نے بڑی شفقت و محبت سے میری ساری باتیں سُنیں مجھے تسلی دی۔

یہ روحی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً سات سال بڑی تھی۔ گھر میں اُس کے امی ابو کے علاوہ اُس کے چار بھائی بھی تھے۔ پہلے ہی دن اُس نے مجھے اپنے گھر کے تمام افراد سے غائبانہ متعارف کروا دیا تھا۔

پاک و ہند کے مشہور و مقبول شاعر

بشیر بدر

غزلیں

آمد

خوبصورت طباعت و کتابت کیساتھ شائع ہو گیا ہے

بشیر بدر جس کی غزلیں آج کی ذہنی کیفیت اور تہذیبی فضا کی جیتی جاگتی متحرک تصویریں پیش کرتی ہیں جس کی غزلیں تازہ ہوا کے نرم جھونکے کی طرح ذہن کو چھوتے ہوئے دل میں اُتر جاتی ہیں،

؎ اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دے
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

قیمت ۶۰/- روپے

آمد کے سول ایجنٹ

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ اُردو بازار کراچی

تمی سے بھی اُس کی کافی دوستی تھی۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے تمی سے ملنے آتی۔ میری طرح دانی اور ماہی سے بھی وہ پہلی بار ملی تھی اور ان سے بھی اُس کی بہت بے تکلفی تھی لیکن مجھ پر وہ خصوصی توجہ دیتی۔ تمی گھر پر نہ ہوتیں تو وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی۔ خود نہ آسکتی تو مجھے گھر بلا لیتی۔ اور پھر ہم گھنٹوں باتیں کرتے۔ میں اپنے دل کی باتیں اُسے بتاتا وہ سب جو میں سوچتا تھا اور محسوس کرتا تھا اس نے میری محرومیوں کے سارے کانٹے چُن لیے تھے۔

میں اُسے آپی کہتا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ میں اُس سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ دل چاہتا تو صرف رو ہی کہہ کر بلا لیتا۔ یہ چھٹیاں پلک جھپکتے میں گزر گئیں۔ جاتے سمے میں بہت اداس تھا اور وہ تو باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"علی تم مجھے بہت یاد آؤ گے اور تم جانتے ہو تم مجھے بالکل سگے بھائیوں کی طرح عزیز ہو گئے ہو۔ بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ۔"

اور مجھے یوں لگا تھا جیسے میں اکیلا نہیں رہا کوئی ہے جو میری خوشیوں پر خوش ہو سکتا ہے اور میرے دکھوں پر رو سکتا ہے۔

ہوسٹل جا کر میں باقاعدگی سے اسے خط لکھتا جواب میں ذرا دیر ہوتی تو پریشان ہو جاتا کہ کہیں وہ مجھ سے خفا نہ ہو گئی ہو۔ اور اس کی خفگی کا تصور مجھے ہولا دیتا۔ جیسے میں ایک دم اکیلا ہو گیا ہوں۔ دانی بھی اُسے یاد کرتا تھا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس میں آخر ایسی کیا بات تھی۔ وہ بہت معمولی شکل کی عام سی لڑکی تھی۔ لمبا بانس جیسا قد۔ سانولا رنگ۔ چھوٹی قدرے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں وہ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی غالباً چھٹی یا ساتویں میں اُس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ بات کرنے کا بھی کوئی خاص سلیقہ نہیں تھا۔

کبھی کبھی تو اُس کا اندازِ گفتگو بالکل گنواروں جیسا ہو جاتا تھا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں جب وہ اپنے چھوٹے بھائی کو گالیاں دیتی یا غصہ ہوتی تو مجھے بہت عجیب لگتا تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے ہم سب کو اسیر کر رکھا تھا۔

تمی بھی اُس کا دم بھرتی تھیں وہ ایک دن نہ آتی تو اسے فون کر کے بلا لیتیں۔ شاید اس لیے کہ وہ محبت کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ اُس نے ہم سب سے بے تحاشا محبت کی بے حساب چاہا۔ گھر آتے ہی وہ پورے گھر پر چھا جاتی تھی۔ تمی کچن میں ہوتیں تو کچن میں گھس جاتی "ہائے آنٹی آپ صبح سے لگی ہیں تھک جائیں گی۔ اتنی نازک سی تو ہیں۔" تمی بہت خوبصورت اور نازک سی تھیں۔

وہ تمی کے منہ کرنے کے باوجود انہیں کچن سے ہٹا دیتی۔ اور کھانا بناتے ہوئے تمی سے باتیں بھی کرتی جاتی۔ ساتھ ساتھ ۔ میرے کمرے میں بھی چکر لگاتی رہتی۔

"کیا کر رہے ہو علی ناچیا! پڑھ رہے ہو۔ چائے بنا دوں۔ ارے تمہارا کمرا کتنا گندا ہو رہا ہے۔ آنٹی؟"

وہ وہیں سے آواز لگاتی۔

"یہ علی کا بچہ آپ کے لیے کام بڑھاتا رہتا ہے۔ میں ذرا اس کا وارڈ روب ٹھیک کر دوں۔"

اور تمی اُس کے سامنے کچھ ظاہر نہ کرتیں کہ وہ تو کبھی میرے کمرے میں جھانکتی بھی نہ تھیں۔

"ٹھیک ہے۔"

وہ روحی کے سامنے اس طرح ظاہر کرتیں جیسے وہ تو میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں میں ہی بدتمیز ہوں۔ روحی کو سب کچھ پتا تھا۔ لیکن تمی کے سامنے وہ اظہار نہ کرتی تھی۔

"بڑی چالاک ہو روحی!" میں ہنستا۔

"تمی کے سامنے کیسے باتیں کرتی ہو۔"

"اپنے چھوٹے سے پیارے بھائی کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ تمہاری تمی مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔ اس لیے کہ وہ تم سے نفرت کرتی ہیں۔ اور تم مجھے بہت پیارے ہو۔ جان سے بھی زیادہ۔ اور اگر میں تمہاری تمی سے دوستی نہ رکھوں نا تو پتا ہے۔ تمہاری تمی کبھی بھی میری اور تمہاری بے تکلفی کو برداشت نہ کریں۔ میں تمہاری تمی کی فطرت کو بہت اچھی طرح سے جان گئی ہوں۔ اور علی تم کبھی افسردہ نہیں ہونا اور کبھی یہ نہیں سوچنا کہ تمہارا کوئی نہیں ہے۔ اب میں ہوں تمہاری بہن۔"

اور مجھے لگتا جیسے میں ایک دم ہی بہت امیر ہو گیا ہوں، مجھے اب کسی کی محبت کی ضرورت نہیں رہی۔ کسی کی رفاقت کی خواہش نہیں رہی۔ نہ دانی کی نہ راحی کی۔

چھٹیوں میں میں بہت خوش بہت مطمئن رہتا۔

وہ گھر آتی تو میرے کپڑے استری کرتی۔ میری کتابیں سیٹ کر کے رکھتی کمرا صاف کرتی۔ اور یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگتا۔ میں اُس پر اس طرح حکم چلاتا۔ جیسے وہ میری سگی بہن ہو۔ وہ نہ آتی تو میں اُسے فون کرتا۔

"آ کر میرے کپڑے استری کر دو۔"

"چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے ذرا چائے آ کر بنا دو۔"

"کیوں میں کوئی تمہاری نوکر ہوں؟" کبھی کبھی وہ چھیڑتی۔

"بہن تو ہو نا۔"

"ہاں۔" اور وہ بھاگی چلی آتی۔

کبھی کبھی ممی ٹوکتیں۔

"علی وہ تم سے بڑی ہے کیوں رعب جماتے ہو۔ دانی کتنے احترام سے بات کرتا ہے اُس سے۔ چھوٹے بھائی سے ہی عقل سیکھ لو۔"

"چھوڑیں آنٹی۔"

وہ ان کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔

"علی اور دانی آپ کے بیٹے ہیں نا اور آپ کی نسبت سے مجھے بہت پیارے لگتے ہیں سگے بھائیوں کی طرح۔ یہ مجھ سے لاڈ کرتے ہیں نا تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ اور اگر یہ آپ کے بیٹے نہ ہوتے نا تو میں انہیں ذرا بھی لفٹ نہ کراتی۔ اور پتا ہے میں امی سے آپ کی اتنی تعریف کرتی ہوں کہ آپ نے کبھی علی اور دانی میں فرق نہیں کیا۔ ایسی مائیں بھلا کہاں ہوتی ہیں۔"

وہ بڑی ہوشیاری سے ممی کی زبان بند کر دیتی تھی۔

ممی نے ہمیشہ ہی اس کی تعریف کی۔

اور میں تو اُس کی محبتوں کا اسیر تھا ہی محبت کا ایک بول کیسے دل کو پگھلا دیتا ہے۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھتا میں اپنے جیب خرچ میں سے پیسے بچا بچا کر مری سے اُس کے لیے گفٹ لاتا۔

"علی!" وہ ناراض ہوتی۔

"کیوں خرچ کرتے ہو میرے لیے فضول میں۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے تمہارے لیے چیزیں خریدنا۔ اور پتا ہے جب میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں گا نا تو — تمہارے لیے —— ڈھیروں چیزیں خرید کروں گا بلکہ تمہاری شادی بہت دھوم دھام سے کروں گا۔"

"مگر تب تک تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔"

"نہیں، تم بوڑھی نہیں ہو گی۔ بس۔"

"بالکل بچے ہو۔"

وہ ہنس کر میرا گفٹ لے لیتی۔

پتا نہیں میں کیا کیا خواب دیکھتا تھا اور کیا کیا سوچتا تھا۔ اُس کی ابھی تک منگنی بھی نہیں ہوئی تھی ممی نے ایک بار بتایا تھا کہ دو تین جگہ اس کی بات چل کر ختم ہو گئی تھی شاید وہ بہت خوبصورت نہیں تھی اور پڑھی لکھی نہیں تھی اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ اتنی اچھی ہے پھر بھی لوگ اُسے ناپسند کیوں کر دیتے ہیں۔

"تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنا روحی۔"

"اور تمہاری بیوی مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دے پھر؟"

"اس سے پہلے میں اُسے نہ گھر سے نکال دوں گا۔"

میں جذباتی ہو جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس کی ان بے تحاشا محبتوں اور خلوص کا صلہ کس طرح ادا کروں

اکثر ہم رات کو دیر تک فون پر باتیں کرتے۔ یوں ہی لایعنی باتیں مستقبل کی باتیں۔ اسکول کی اپنے دوستوں کی۔ اور اُس کی۔ ایک بار اُس نے مجھے بتایا تھا کہ مجھ سے ملنے سے پہلے وہ بھی بڑی تنہائی محسوس کرتی تھی۔ چھوٹے بھائی لاپروا تھے اور بڑے مصروف امی اور ابو کی اپنی لائف ہے۔ اور ایسے میں وہ بہت اکیلی تھی۔ اور یوں ہم روز بروز ایک دوسرے کے بہت قریب آتے جا رہے تھے۔ اور یہ قربت اور بھی بڑھ گئی جب ڈیڈی اچانک چند دن بیمار رہ کر چل بسے۔

یہ اچانک حادثہ میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اُن دنوں میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھا کہ اچانک ہی سعودی عرب سے ڈیڈی کے انتقال کی خبر آ گئی۔ میں تو ایک دم پاگل سا ہو گیا۔ روحی نے ان دنوں ہم سب کی بہت دلجوئی کی۔ جب تک ڈیڈی کی ڈیڈ باڈی آ نہ گئی وہ ہمارے ہی گھر پر رہی۔ ممی کی دلجوئی کرنے والے بہت تھے اُن کے بھائی بھابیاں، بہنیں۔ اکیلا تو میں تھا۔ میرا کوئی نہیں تھا۔ خیال میں بھی کوئی نہیں تھا۔

ممی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں اور اگر کوئی دور کا رشتہ دار تھا بھی تو ڈیڈی نے شاید دوسری شادی کے بعد سب سے ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ سو میں اکیلا تھا سوچتا ہوں اُن دنوں روحی نہ ہوتی تو شاید میں اس شدید غم کو برداشت نہ کر سکتا۔ وہ میرے ساتھ مل کر روئی اس نے میرے آنسو

پونچھے۔ اور مجھے حوصلہ دیا۔ میں گھنٹوں اس کی گود میں سر رکھ کر روتا رہتا اور اس کے آنسو میرے رخساروں پر گرتے رہتے۔ اور میں سوچتا کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں روحی آپی جیسے بے لوث محبت کرنے والے۔

میں کیا لگتا تھا اس کا، مگر وہ میرا اس طرح خیال رکھتی تھی جیسے میں اس کا سگا بھائی تھا۔ ہولے ہولے میں سنبھل گیا۔ ڈیڈی کی زندگی میں مجھے اتنا اندازہ نہیں تھا کہ میں ڈیڈی سے اتنی زیادہ محبت کرتا ہوں۔ مگر اب جب وہ نہیں رہے تھے تو مجھے اپنا آپ خالی خالی لگتا تھا۔ جیسے میں ایک دم سے اکیلا ہو گیا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ ڈیڈی مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتے جتنی وانی اور راحیل سے کرتے ہیں۔ مگر مجھے اب ان کی موت کے بعد پتا چلا تھا کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ ان کا آخری خط جو انہوں نے ہاسپٹل سے مجھے لکھا تھا۔ ان کی بے تحاشا محبتوں کی گواہی تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"علی بیٹا موت شاید مہلت نہ دے اور زندگی میں اب تم سے ملاقات نہ ہو سکے اس لیے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کے لیے تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ مگر وقت سے پہلے تم پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال رہا ہوں۔"

انہوں نے مجھے بہت سی نصیحتیں لکھی تھیں۔ اور لکھا تھا کہ ان کے بعد وانی، راحیل اور ممی کا خیال رکھوں۔ اگر ممی مجھ سے زیادتی بھی کر جائیں تو بڑے ظرف کا ثبوت دوں۔ کہ اب میں ہی گھر کا بڑا تھا۔

ڈیڈی نے کسی کی حق تلفی نہیں کی تھی اور سب جائیداد تقسیم کر دی تھی۔ ممی، وانی، راحیل اور میرا سب کا الگ الگ حصہ تھا۔ یہ گھر جس میں ہم رہتے تھے میرے نام تھا اس کے علاوہ اسلام آباد کی ساری جائیداد میری تھی۔ کیونکہ یہ میری ممی کا تھا۔ ڈیڈی نے لکھا تھا۔ علی بیٹے! میں تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرنا چاہتا۔ اپنی ماں کی ہر چیز کے تم وارث ہو۔ سیف کی چابی میرا وکیل تمہیں دے دے گا۔ تمہاری ماں کا زیور ہے اسے ضائع مت کرنا میں نے تمہاری دلہن کے لیے سنبھال کر رکھا تھا کہ یہ تمہاری ماں کی بھی خواہش تھی۔ البتہ ابھی تم کم عمر ہو اس لیے بیس سال کی عمر تک تمہاری ممی تمہاری نگہبان رہیں گی۔ برا نہ ماننا تمہاری عمر کے لڑکوں کے پاس جب یوں اچانک دولت آجائے تو بہت سے غلط لوگ انہیں گھیر لیتے ہیں۔

اور انہوں نے التجا کی تھی کہ ممی کو گھر سے نہ نکالوں۔ بلاشبہ اس گھر کا مالک میں ہوں لیکن جب تک وہ زندہ ہیں، انہیں اس گھر میں رہنے دوں۔

روحی کو میں نے ڈیڈی کا خط پڑھوایا تھا۔ ڈیڈی کی وصیت نے ممی کا موڈ آف کر دیا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہی تھیں کیونکہ اب وہ مجھ سے تعلق رکھنے پر مجبور تھیں۔ ممکن ہے ڈیڈی وصیت نہ کرتے تو وہ مجھے گھر سے ہی نکال دیتیں۔ کیونکہ میں ان کی آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ مگر اب وہ مجھے برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ ننگی تلوار بن جاتیں۔ اور میں ڈیڈی کی خاطر ان کی ہر بری بھلی بات برداشت کر لیتا۔ مگر میرا دل بہت دکھتا۔

کبھی کبھی تو دل چاہتا یہ دنیا چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ڈیڈی کے پاس۔ اور ایسے میں روحی مجھے بہت سہارا دیتی۔ میں نے میٹرک کے بعد لاہور میں ہی رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا ممی اکیلی ہیں اور میرا گھر میں رہنا ضروری ہے۔

اس لیے میں واپس مری نہ گیا اور لاہور میں ہی۔ ایڈمیشن لے لیا۔ ممی جانتی تھیں کہ میں صرف ان کی خاطر لاہور میں رکا ہوں۔ مگر وہ دوسروں کے سامنے یہ ظاہر کرتیں کہ میں نے انٹر لارنس کالج سے نہ کر کے ڈیڈی کی برسوں کی محنت ضائع کر دی ہے۔

کالج سے آکر میں کچھ دیر آرام کرتا اور پھر شام کو فون کر کے روحی کو بلا لیتا اور اگر وہ نہ آتی تو خود اس کے گھر چلا جاتا اور اگر ایک دن بھی میں اس سے نہ مل پاتا تو مجھے یوں لگتا جیسے کچھ کھو سا گیا ہے۔ شکر ہے ممی کو بھی روحی کی آمد یا میری اس سے بات چیت پر

اعتراض نہ ہوا۔ بلکہ وہ تو خود اُس کے خلوص کی معترف تھیں۔ میں ذرا اُداس ہوتا تو چھم چھم آنسو اُس کی آنکھوں سے بہنے لگتے۔

وہ پریشان ہو جاتی۔ میں بیمار ہوا تو اُس نے سب کچھ بھول کر میری تیمارداری کی۔ اپنی ممی کی ڈانٹ کے باوجود وقت بے وقت چلی آتی۔

"تمہیں کیا خبر علی کہ تمہاری خاطر میں زبیر بھائی اور امی کی کتنی ڈانٹ کھاتی ہوں۔ زبیر بھائی کو میرا اس طرح بار بار تمہارے گھر آنا بالکل پسند نہیں ہے۔ مگر"

اور میں اس کا ممنون ہوتا۔ دل ہی دل میں سوچتا کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے روحی جیسی بہن مل گئی ہے۔ میں اُس کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا حتیٰ کہ جان بھی دے سکتا تھا۔ وہ مجھے اتنی ہی عزیز ہو گئی تھی۔ ممی کی تلخ و ترش باتیں بھی میں بھلا دیتا۔ میں ہر بات اُس سے کرتا تھا اور وہ میری ہر بات کی تائید کرتی۔ میرا حوصلہ بڑھاتی۔

روما ممی کی دور دراز کی رشتہ دار تھی پہلی بار میں نے اُسے ڈیڈی کی وفات کے بعد دیکھا تھا۔ وہ تین چار بار اپنی امی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی اور پھر خود ہی اُس نے مجھے فون کیا۔ وہ پیاری سی شکل کی خوش مزاج لڑکی تھی۔ مجھے اُس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ میری ہم عمر تھی۔

اور ہماری پسند یدہ و ناپسند تقریباً ایک سی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ مگر جب ممی کو پتا چلا کہ روما مجھے فون کرتی ہے تو وہ بہت خفا ہوئیں۔

"مجھے یہ سب پسند نہیں ہے علی۔ کل کو دانی وغیرہ آئیں گے تو تم اُن کے لیے یہ مثال پیش کرو گے؟"

"مگر ممی میں اُس سے فلرٹ تو نہیں کر رہا بس وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ اور میں اُس سے شادی کروں گا۔"

میں نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

"لڑکے تمہاری ابھی عمر کیا ہے اور ابھی سے شادی کی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"شادی تو ظاہر ہے دس سال بعد ہی کروں گا۔"

"مگر اس لڑکی سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔ تمہارے ڈیڈی کو وہ لوگ سخت ناپسند تھے۔ اور آئندہ تم اُسے فون نہیں کرو گے۔" انہوں نے حکم دے دیا۔

میں بہت اداس تھا۔ روما نے اس بات کی تائید کر دی تھی کہ اس کے ڈیڈی اور میرے ڈیڈی میں بہت اختلاف تھے اور شاید اُس کے ڈیڈی اس شادی کو اب بھی پسند نہ کریں۔

تب روحی نے میری اداسی کو دور کر دیا۔

"منہ کیوں لٹکا رہے ہو۔ کورٹ میرج کر لینا اتنی ہی پسند ہے وہ تمہیں۔"

"مگر"

"چھوڑو یار آوہ۔ یونہی بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔ "زندگی تم نے گزارنی ہے یا تمہاری ممی نے؟"

اور یوں میں نے جب بھی روما سے بات کرنی ہوتی یا روما نے مجھے فون کرنا ہوتا وہ مجھے روحی کے ہاں فون کر دیتی تھی۔ روحی کے امی ابو نے کبھی میرے یوں بے تکلفی سے اپنے گھر آنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کی امی ہمیشہ خوش دلی سے مجھے ملتیں۔ اُس کے ابو بھی دو چار باتیں کر لیتے تھے۔ بھائیوں سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی۔

ڈیڈی کی وفات کے بعد تو روحی ہمارے اور بھی قریب ہو گئی تھی۔ کبھی شاپنگ کے لیے جاتی تو ممی کے لیے کوئی شرٹ پیس، دانی کے لیے کوئی جینز، کوئی بال پین راحی کے لیے کوئی کھلونا لے آتی۔ کبھی میرے لیے جوتے خرید لاتی، کبھی سوٹ لے آتی۔

میں نادم ہو جاتا۔

"روحی! تمہارا خلوص اور تمہاری محبت ہی میرے لیے ایک انمول خزانہ ہے۔ اتنے احسان مت کرو مجھ پر کہ میں سر بھی نہ اُٹھا سکوں۔"

"میں تمہارے لیے کچھ نہیں لاتی اپنے بھائی کے لیے لاتی ہوں۔"

"اور وہ جو دانی اور ممی کے لیے پیسہ خرچ کرتی ہو وہ ۔۔؟"

"تمہارے بھائی اور ممی ہونے کے ناتے سے۔"

وہ مجھے لاجواب کر دیتی تھی۔

اُسے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر ہمارے گھر آ کر وی سی آر پر فلمیں دیکھتی تھی۔ ایک روز اُس نے کہا۔

"کاش! میرے پاس کچھ پیسے ہوتے تو میں وی سی پی

لے لیتی۔"

تب میں نے سوچا کہ اُسے وی۔سی۔پی لے دوں گا۔ میرے اکاؤنٹ میں کافی رقم تھی۔ ڈیڈی کے بعد ہر ماہ جیب خرچ کے لیے مجھے وکیل کی معرفت رقم ملتی تھی۔ اور میرے کوئی خاص اخراجات نہ تھے۔ نہ تو مجھے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ نہ ہی میں کالج کے بعد کہیں آتا جاتا تھا۔ دوست بھی میرے کوئی خاص نہ تھے۔ کالج کے اخراجات بہت کم تھے۔ سو میں نے اُسے وی۔سی۔پی لے دیا۔

"علی!" اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ تم کیوں لائے ہو۔؟"

"بس کچھ مت کہنا روحی! میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔؟ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے کہ تم فلم دیکھنے کے لیے خوامخواہ ممی کی خوشامد کرو۔"

اور اُس نے میرا ہاتھ تھام کر اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ ہمارے گھر کے ایک فرد کی سی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو وہ بھرپور طریقے سے شیئر کرتی۔

دانی کی اور میری برتھ ڈے پر اُس نے خود کیک بنایا۔ پارٹی ارینج کی اور ہمیں گفٹ دیے۔ مجھے ایک پارکر پین اور دانی کو کتابوں کا ایک خوبصورت سیٹ دیا۔

راحیل نے اپنی جماعت میں فرسٹ پوزیشن لی تو فٹافٹ پارٹی ارینج کر لی۔ راحیل کو خوبصورت بیٹری سے چلنے والا جہاز گفٹ کیا۔

"روحی بہت مخلص ہے۔"

یہ ممی کی رائے تھی۔ اور مجھے تو وہ روما سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ میں روما سے محبت کرتا تھا اس کے ساتھ زندگی گزارنا میرا ایک خواب تھا۔ لیکن اگر روحی کہتی تو میں روما کو بھی چھوڑ سکتا تھا۔ اتنا اندھا اعتماد تھا مجھے اس پر! اتنی گہری اور شدید محبت تھی مجھے اس سے۔ ایک روز میں اُس سے ملنے گیا تو وہ بہت اداس بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا روحی؟"

اور ٹپ ٹپ آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

"کچھ نہیں۔"

"تمہیں میری قسم روحی! مجھے بتاؤ۔"

"مجھے اپنی قسم مت دیا کرو علی! تم نہیں جانتے تم مجھے کتنے عزیز ہو۔"

"جانتا ہوں، اس لیے تو اپنی قسم دیتا ہوں۔"

وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اچھا اب بتاؤ، کیا بات ہے۔"

"پتا ہے وہ امی کا لاکٹ تھا۔ میں ایک دن بازار میں گر گئی تھی کہیں گم ہو گیا۔ گر گیا شاید۔ امی روز مجھ سے پوچھتی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ چپکے سے نیا خرید لوں گی۔ امی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔ مگر جب اُس کی قیمت پتا کی تو پورے دس ہزار روپے اور میرے پاس تو صرف ایک ہزار روپیہ ہے۔"

وہ پھر رونے لگی۔

"پلیز روحی مت روؤ۔"

اُس کے آنسو مجھے بے چین کرنے لگے۔

"میں کوشش کروں گا کہ دس ہزار۔"

"نہیں۔ نہیں تم کہاں سے لو گے۔ رہنے دو۔ بہت ہو گا تو امی مجھے ماریں گی، گالیاں دیں گی۔ تو دیتی رہیں۔ بچپن سے اُن کی مار کھا رہی ہوں۔"

"تمہاری ممی۔ تمہاری سگی ممی تمہیں مارتی ہیں۔؟"

"ہاں وہ ایسی ہی ہیں۔ انہیں اولاد سے ذرا بھی محبت نہیں۔ میں نے تو تم سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ تم خود پریشان رہتے تھے تمہیں کیا بتاتی۔ وہ تو ذرا سی غلطی پر مار مار کر لہولہان کر دیتی ہیں۔"

"نہیں۔" میرا دل درد سے بھر گیا۔

"اب وہ تمہیں نہیں ماریں گی میں شام تک دس ہزار روپے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"نہیں پلیز۔"

اُس نے مجھے روکا لیکن میں چلا آیا۔ گھر آ کر میں گھنٹوں سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ اپنا کیمرہ، اپنا ڈیک بیچ دوں۔ مگر شاید پھر بھی دس ہزار نہ ہو سکیں۔ ممی سے مانگوں۔

اور جب ممی سے پانچ ہزار روپے مانگے تو انہوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"باپ کے مرتے ہی عیاش ہو گیا ہے۔ کہاں ضائع کرتے ہو پیسہ؟ میرے پاس کچھ نہیں۔ دانی کی فیس جمع کروانی ہے۔"

اور۔۔۔

میں دلگرفتہ سا ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تب مجھے

ممی کے زیورات کا خیال آیا۔ میں نے ڈیڈی کی ہدایات کے مطابق زیورات اُن کے سیف سے نکال کر بینک کے لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ یہ لاکر میں نے اپنے نام سے لیا تھا۔ میں خاموشی سے بینک چلا گیا۔ اور ایک خوبصورت نیکلس نکال کر لے آیا۔ پتہ نہیں ہی دیر تک نیکلس ہاتھوں ممی کی گردن کو چھوا ہوگا۔ وہ اسے پہنتی ہوں گی۔ اور میں۔ میں نے اپنے لب اس نیکلس پر رکھ دیے۔ اسے فروخت کرتے ہوئے میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ کوئی درد ہولے ہولے میرے دل کو چھیل رہا تھا مگر میں روحی کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ اگر میری جان بھی مانگتی تو میں دے دیتا۔

پھر یہ تو ایک نیکلس تھا بے جان۔

وہ جو میرے ایک آنسو پر دریا بہا دیتی تھی۔

میں اُس کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اور میں نے نیکلس فروخت کر دیا۔

وہ تقریباً سولہ ہزار میں بکا تھا۔

دس ہزار روحی کو دے کر باقی میں نے بینک میں جمع کروا دیے۔ میں نے سوچا تھا اگر یہ نیکلس فروخت نہ ہوا تو خرید کر پھر اسے ممی کے زیورات میں رکھ دوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی پھر میرے پاس اتنا پیسہ جمع ہی نہ ہو سکا کہ میں اُسے خرید سکتا۔ دراصل روحی بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے رو پڑتی تھی۔

"ابو بہت پریشان ہیں بزنس گھاٹے میں جا رہا ہے اور مکان کا کرایہ دینا ہے۔"

میں خاموشی سے اُسے پیسے دے دیتا۔

یوں ہی کئی بار ایسا ہوا کہ روحی کے آنسوؤں نے مجھے پریشان کر دیا۔

میں نے اپنا ڈیک، اپنا کیمرہ، چھوٹا سا کلر ٹی وی فروخت کر دیا تھا۔ اس لیے کہ میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اُس نے میرے دکھوں کو شیئر کیا تھا۔ میں اکیلا تھا اُس نے مجھے اپنائیت کا احساس دیا۔ مجھے زندہ رہنے کی اُمنگ دی، میری خوشیوں پر خوش ہوئی اور میرے دکھوں پر روئی۔ مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ میں نے اُس کے لیے کچھ کیا ہے۔ کبھی وہ میری پریشانیاں شیئر کرتی تھی۔ اب میں اُس کے دکھوں کو شیئر کرتا تھا۔

پتا نہیں اچانک کیا ہوا تھا اُس کے گھریلو حالات ایک دم سے خراب ہو گئے تھے۔

"ابو کا بزنس بالکل ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اور دونوں بڑے بھائی گھر میں ایک پیسہ تک نہیں دیتے۔ اور چھوٹے تو خیر خود ابھی پڑھتے ہیں۔" اُس نے ایک روز مجھے بتایا۔

"دل چاہتا ہے کہیں سروس کر لوں لیکن میں تو میٹرک پاس بھی نہیں ہوں۔ علی مجھے کہیں سروس دلا دو نا۔"

"بکو نہیں۔"

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔

"آئندہ ایسی بات ہرگز نہ کرنا۔ اور تمہیں جتنے پیسے بھی چاہیے ہوں مجھ سے لے لیا کرو۔ بلا جھجک۔"

"مگر مجھے شرم آتی ہے علی۔"

"اس کا مطلب ہے، تم مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتی ہو۔"

میں اُس سے خفا ہو گیا تو اُس نے مجھے منا لیا۔ میں جب کبھی بھی روٹھتا تھا تو مجھے منا لیتی تھی۔

ممی میری گارجین تھیں۔ اُس کی وجہ سے میں نے ممی سے مطالبہ کیا کہ وہ اسلام آباد کے مکان کا کرایہ مجھے دیا کریں۔

"کیوں تم اپنا جیب خرچ کیا کرتے ہو؟"

"میں اب بڑا ہو گیا ہوں، میری ضرورتیں زیادہ ہیں۔"

"کیا ضرورتیں ہیں تمہاری، میں جانتی ہوں دوستوں میں فضول اُڑا دیتے ہو۔"

"ممی! میں فضول خرچ نہیں کرتا۔ اور پھر وہ مکان میرا ہے، میری ممی کا ہے۔"

"لیکن ابھی تم صرف سترہ سال کے ہو، بیس سال کی عمر تک میں تمہاری گارجین ہوں۔"

اور ممی سے میری روز لڑائی ہونے لگی۔

"ممی سے مت لڑا کرو میرے لیے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی۔

"کیوں نہ لڑوں، تم اتنی پریشان رہتی ہو اور میں اتنے ڈھیروں روپیوں کا مالک ہو کر بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

میری سوچ میں ابھی پختگی نہیں آئی تھی۔ بس میں تو

صرف اُس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے خلوص و محبت کا صلہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ ایک روز دانی نے مجھ سے کہا۔

"بھائی! روحی کے گھر والے اچھے لوگ نہیں ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا ہے۔ ٹھگ قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے اُدھر رہتے تھے، اُن کے گھر کے پاس۔"

"بکواس نہ کرو۔"

میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"اگر روحی کے گھر والے اچھے نہیں بھی ہیں تو ہمیں اس سے کیا۔ روحی تو اچھی ہے نا۔"

"بھائی! تمہارا ڈیک کدھر ہے تم نے روحی باجی کو تو نہیں دے دیا؟" ایک روز اُس نے پوچھا۔

"یار! تم میرے بڑے بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔"

میں نے محسوس کیا تھا کہ ڈیڈی کے بعد دانی میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تھا۔

خلاف مزاج اُس روز میں نے نرمی سے کہا ورنہ میں روحی کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتا تھا۔

"بھائی کل دوپہر روحی باجی بازار میں شاپنگ کر رہی تھیں اور اُن کے ساتھ وہ سامنے والوں کا سہیل تھا۔"

میں نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

تب ہی روحی باہر ہی سے مجھے پکارتی ہوئی آگئی۔

"روحی! کل دوپہر تم کہاں تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں نہیں گھر پر سو رہی۔"

"جھوٹ! یہ دانی تو کہہ رہا ہے۔"

"مجھے تمہارے سر کی قسم علی۔"

اُس نے ایک دم دونوں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیے۔

"میں تو گھر پر ہی تھی۔"

اور میں نے فخر سے دانی کی طرف دیکھا۔ مجھے پتا تھا وہ مجھ سے جھوٹ کبھی نہیں بول سکتی۔

"پرایا بیٹا ہے۔" دانی نے مذاق کیا۔

"روحی باجی! زبیر بھائی کے سر کی قسم کھائیں نا۔ ہمیشہ آپ کے ہی سر کی قسم کیوں کھاتی ہیں۔"

"دانی!" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"چلو جاؤ میرے کمرے سے۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا تھا دل چاہا تھا۔ ایک تھپڑ لگاؤں لیکن پھر میں نے سوچا تھی یوں ہی بڑبڑاتی رہیں گی اور خوامخواہ بدمزگی ہوگی۔ مجھے روحی کی بات پر یقین تھا۔ یقیناً دانی کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے روحی کو ساری بات بتا دی۔ اور روحی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ تو سہیل کو جانتی تک نہیں۔

اور پھر یوں ہی بہت سارے دن گزر گئے۔ میرا ایف ایس سی کا امتحان قریب تھا۔ اس لیے میں پڑھائی میں مصروف ہوگیا تھا۔ میں نے ٹیوشن بھی لگوائی تھی، کیونکہ میں ڈیڈی کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ایک روز میں ٹیوشن پڑھ کر آیا تو بے اختیار میرا دل روحی سے ملنے کو چاہا۔ دو تین روز سے میں اُس سے نہیں ملا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح بے دھڑک اندر چلا گیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ شاید روحی اپنے کمرے میں تھی۔ میں سیدھا اُس کے کمرے کی طرف گیا۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ شاید زبیر بھائی تھے۔ میں یونہی رُک گیا اور سوچنے لگا کہ اندر جاؤں یا یہاں سے ہی واپس پلٹ جاؤں کیونکہ ایک بار روحی نے مجھے بتایا تھا کہ زبیر بھائی کو اُس کا مجھ سے بے تکلفی سے ملنا پسند نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جانے کے بعد زبیر بھائی اس سے خفا ہوں۔

"تم علی سے مانگ لو نا!"

اندر شاید زبیر بھائی کہہ رہے تھے۔ میں اپنا نام سُن کر ٹھٹھک گیا۔

"مگر ابھی اُس دن تو میں علی سے دو ہزار روپے لائی تھی، اب پھر اتنی جلدی؟"

"کیا حرج ہے بھئی، وہ بیوقوف لڑکا جہاں سے بھی ہوگا تمہیں لا دے گا۔"

میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔

"ٹھنڈا کر کے کھاؤ زبیر! اتنی آفت مت مچاؤ۔"

یہ شاید اُس کی امی کی آواز تھی۔

"تو پھر سہیل سے لے لو نا۔ مجھے کراچی جانا ہے، ہوٹل میں رہوں گا تو خرچ بھی ہوگا۔"

"مگر سہیل کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔" روحی کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی میں سہیل سے بات کروں گی، مگر زبیر! پلیز تم بہت بے صبرے ہو حوصلے سے اور صبر سے کام لو۔ دو تین سال کی بات ہے، علی اپنی جائداد سنبھال لے گا تو پھر دیکھنا تم ساری جائداد اپنے نام نہ کروا لی تو میرا نام بھی روحی نہیں۔"

"نہیں۔"

سگی بہنوں سے کرتا ہے۔
میں نے اُسے اپنا دوست سمجھا تھا۔
اس بھری دنیا میں اُسے ہی واحد اپنا سمجھتا تھا۔
مگر وہ۔
آدمی کتنا دوغلا ہوتا ہے، کتنا بڑا اکیٹر ہوتا ہے کیسے اپنا اصل روپ چھپا لیتا ہے۔
میں جو سوچتا تھا کہ روحی ــ کو ہمیشہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اور اگر ساری زندگی بھی مجھے اور میری بیوی کو اس کی خدمت کرنی پڑی تو میں کروں گا کہ اُس محبت کا کوئی صلہ نہیں تھا جو وہ مجھ سے کر رہی تھی۔ اور میں سوچتا تھا اگر کبھی مجھے روحی ــ سے جدا ہونا پڑا تو میں کیسے اس سے بچھڑ سکوں گا۔
اب خود ہی میں نے اُن سے کنارا کر لیا تھا۔ اور ساری دنیا سے متنفر ہو گیا تھا۔ ممی نے، دادی نے سب نے میری خاموشی اور اداسی کو محسوس کیا تھا۔ بارہا میں نے سوچا کہ میں یہ گھر چھوڑ دوں۔
جہاں وہ بالکل سامنے رہتی تھی۔
اُس کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے نگاہیں خود بخود اُس کے گھر کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ اور دل ٹوٹنے لگتا تھا۔ دکھ گہرا شدید دکھ اندر ہی اندر کاٹنے لگتا۔
پھر یوں ہوا کہ ایک رات اچانک وہ لوگ چلے گئے کہاں؟
یہ کسی کو خبر نہیں تھی۔ کئی دن تک اُن کے جانے کا چرچا رہا۔ اور بہت سی باتیں سننے میں آئیں۔
روحی نے ممی سے بھی چھ ہزار روپے اُدھار لے رکھے تھے۔ سہیل کی ماں اُسے گالیاں دے رہی تھیں۔ سُنا تھا وہ سہیل سے ہزاروں روپے لے گئی تھی۔ اردگرد کے کئی گھروں سے اُس نے کچھ نہ کچھ لے رکھا تھا۔ سامنے والی آنٹی سے ایک دن کے لیے وی۔ سی۔ آر مانگا تھا اور رات کو ہی چلے گئے تھے۔
ممی حیرت اور دکھ سے اُس کا ذکر کرتیں تو میں وہاں سے اُٹھ جاتا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی اُس کا ذکر نہ کرے۔ کوئی اُس کی بات نہ کرے۔ مجھے اُن پیسوں کا دکھ نہ تھا جو میں نے اُس کی ذات پر خرچ کیے تھے۔ مجھے تو اُس محبت کا دکھ تھا۔ جو فریب تھی جو مجھ سے چھین گئی تھی۔
میرا سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔ میں سب سے زیادہ گھاٹے میں تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا۔
سب سامنے والی آنٹی اور سہیل کی امی سے افسوس کرتے۔ اور میں۔ میں سوچتا۔ وہ سب کے ساتھ دھوکا کرتی۔ وہ اس سے بھی بُری ہوتی لیکن میرے ساتھ اُس کی محبت، اُس کا خلوص سچ ہوتا تو بخدا میں سب کے منہ بند کر دیتا۔
اُس کے سارے قرض چکا دیتا۔
اُس کی ساری پریشانیاں اپنے سر لے لیتا۔
مگر اُس کے لفظ مجھے ڈنک مارتے رہتے۔
"علی وہ پاگل بیوقوف لڑکا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اُسے سگے بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں ہوں۔ بالکل احمق ہے وہ تو دیکھ لینا، ایک دن میں اُس کی ساری جائداد اپنے نام کروا لوں گی۔"
اور میں بے چین سا ہو جاتا۔
میں جو اٹھارہ سال کا ایک جذباتی لڑکا تھا۔
ہمیشہ کے لیے محبتوں سے متنفر ہو گیا۔
میں نے اپنی ایک الگ دنیا بسائی۔
اپنی پڑھائی میں کھو گیا۔
کتنے برس بیت گئے میں تعلیمی منازل طے کر کے عملی زندگی میں آ گیا۔ کتنے سارے لوگ اس دوران مجھے ملے۔ بظاہر بہت مخلص اور ہمدرد مگر میں سب سے دامن بچا کر نکل جاتا تھا۔ جہاں کہیں مجھے محسوس ہوتا کہ اُن کی محبت حد سے بڑھنے لگی ہے میں وہاں سے کترا کر نکل آتا۔ ہمایوں فخر، وقار کتنے اچھے اچھے دوستوں کو میں نے چھوڑ دیا تھا۔
میں سب سے الگ سب سے علیحدہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ لوگ کہتے تھے میں مغرور ہوں تنک مزاج ہوں، بے حس ہوں۔ سوشل ریلیشنز نہیں رکھ سکتا کسی سے۔ مگر میں کیسے اپنا دل چاک کر کے اُنہیں دکھاتا کیسے اُنہیں بتاتا کہ کتنی کم عمری میں میرے دل پر کتنا گہرا زخم لگا تھا۔ جو اب بھی رستا رہتا ہے۔ اذیت دیتا رہتا ہے، جانے یہ زخم کب بھرے گا۔ جانے کب میرا اعتماد بحال ہو گا۔ ہو گا بھی یا نہیں۔
فخر کے حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے التفات سے گھبرا کر میں نے یہاں اس دور دراز قصبے میں ٹرانسفر کروا لیا تھا۔ اور سوچا تھا یہاں کسی سے اتنے تعلقات نہیں رکھوں گا کہ ٹوٹنے کا خدشہ ہو۔ مگر یہ رضا۔ رضا گیلانی جانے کیسے کس طرح میرے اتنے قریب آ گیا اور پھر اس کی نسبت سے اُس کی

ماما اور ایمن۔

ایمن بے انتہا دلکش سادہ سی لڑکی۔

اور ماما۔ شفیق اور مہربان۔

کئی بار میرا دل چاہا کہ ہر بات کو بھلا کر چپ چاپ ماما کی مہربان گود میں سر رکھ دوں اور کہوں۔

"ماما! مجھے اپنی شفیق باہوں میں لے لیجیے۔

میں جلتے انگاروں پر سفر کرتا آیا ہوں۔ میرے سر پر تپتا سورج رہا ہے۔ کہیں کوئی شجر سایہ دار کوئی ٹھنڈی چھاؤں نہیں ملی۔ اتنے برسوں سے تنہا جی رہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں جو میرا اپنا ہو۔"

کئی بار دل چاہا ایمن سے کہوں۔

"اچھی لڑکی! آؤ میرے دل کے رستے زخم پر اپنے ہاتھوں سے پھاہے رکھ دو۔ میرا وہ اعتماد جو محبتوں سے اٹھ گیا ہے اسے پھر سے جوڑ دو۔ مجھے اپنی محبت کی پناہ میں لے لو۔

اور میرے دل میں چبھے سارے کانٹے چن لو مگر کوئی ہولے ہولے چپکے چپکے میرے اندر کہتا رہتا۔

نہیں علی نہیں۔

بے یقینی کے موسم میں۔

اپنے ذہنوں کے زرخیز کھیتوں میں تم

چاہتوں، خواہشوں کی کوئی فصل بونا نہیں۔

سنو۔

موسموں پر ہمارا تمہارا کوئی بس نہیں۔

کیا خبر دیوتا بے یقینی کی رت کو۔

کس قدر طویل عمری کا مژدہ سنائیں۔

اور چاہتیں، خواہشیں۔

نہیں علی نہیں۔

لیکن یہ بے یقینی کا موسم کب ختم ہوگا۔ اور اندیشوں کی آکاس بیلیں کب تک نمو پاتی رہیں گی۔

ایمن گیلانی مجھے اپنی محبت دے دو۔ اور میں نے بارہا سوچا کہ میں آج ضرور رضا سے کہوں گا۔ میرے دل میں چھپے بے یقینی کے یہ سارے کانٹے نکال پھینکو مگر ہر بار ایک خوف نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اور اگر ایمی، رضا اور ماما کی محبت بھی ایک فریب ہوئی دھوکا ہوئی تو۔ تو نہیں میرے دل میں اتنی سکت نہیں ہے۔ کہ اب کوئی دھوکا کوئی فریب برداشت کر سکوں۔ اب کے میں ٹوٹا تو شاید کبھی نہ جڑ سکوں گا۔

ہاں میں نے ٹھیک کیا جو رضا اور ایمی کو ان کا اصل چہرہ دکھا دیا ہے۔ اب۔ اب۔ یقیناً وہ میرے پاس اپنی محبتیں اور خلوص لٹانے نہیں آئیں گے۔

اُف! یہ فریبی اور مکار خود غرض دنیا۔ کیا یہاں اس دنیا میں کوئی کسی سے سچی پُرخلوص اور بے غرض محبت نہیں کر سکتا جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ کوئی فریب نہ ہو۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

میں اتنے سارے سالوں سے نہیں رویا تھا۔

روحی کے فریب کا پردا چاک ہونے کے بعد بھی نہیں، میرے اندر صحرا بن گیا تھا۔ اور کہیں کوئی مژدۂ آب نہیں ملتا تھا۔ اور میرے خشک آنسو میرے اندر آگ لگائے رکھتے تھے۔ اب بھی میرا اندر جل رہا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا مگر میری آنکھیں خشک تھیں۔

میں یونہی سر تھامے بیٹھا رہا۔ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ میں نے سوچا میں صبح ہی ٹرانسفر کے لیے درخواست دے دوں گا۔ کہیں اب میں یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے دل میں اندر کہیں شاید ایمی رضا اور ماما کے لیے محبت کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ یہ کونپلیں تناور درخت بنیں مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے اس لیے کہ تناور درخت بہت مشکل سے ٹوٹتے ہیں۔ بہت ٹوٹ پھوٹ مچاتے ہیں۔ اور اپنے پیچھے اس ٹوٹ پھوٹ کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ جڑیں کہیں اندر گہرائی میں ہی رہ جاتی ہیں۔ جیسے جیسے روحی کی محبت کی جڑیں آج بھی میرے اندر گہرائی میں ہیں۔ کاش میں انہیں اکھاڑ کر پھینکنے کی سکت رکھتا۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے سر اٹھایا تو۔ دروازے میں رضا کھڑا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں ملال کے رنگ تھے۔

"رضا!" میں حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت حیران ہوتے ہو کہ کس قدر ڈھیٹ ہے کہ اتنی بے عزتی کے بعد پھر آ گیا۔" ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔

ندامت سے میری آنکھیں جھک گئیں۔

"سوری رضا! میں شاید اپنے آپ میں نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں علی! میں جانتا ہوں کہ تم شدید دباؤ

کا شکار ہو۔ اس لیے تو پھر آگیا ہوں۔ ماما کو تمہاری بہت فکر تھی۔ آج بھی وہ منع کر رہی تھیں کہ جب تک تم بالکل صحت یاب نہیں ہو جاتے تمہیں گھر لے آؤں۔"

"تم۔ تم سب لوگ بہت اچھے ہو علی لیکن شاید میں۔ میں ہی بہت برا ہوں۔ میں تم لوگوں کی محبتوں کے قابل نہیں ہوں۔"

"میں جانتا ہوں علی!"

رضا نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا۔

"یقیناً تمہارے ساتھ کوئی حادثہ گزرا ہے۔ کوئی بہت بڑا المیہ۔ تمہارے ساتھ کسی نے بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ لیکن سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے اس دنیا میں جینے کے لیے بھروسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ آدمی لوگوں سے کٹ کر الگ ہو کر جی نہیں سکتا فرینڈ!"

"شاید تم صحیح کہتے ہو مگر میں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ خوف آتا ہے میں اعتماد کے ٹوٹنے سے ڈرتا ہوں۔ میں محبتوں کے جھوٹ ہونے سے خوف کھاتا ہوں۔"

"علی! درست سمجھ کر نہ سہی، یوں ہی ایک سامع سمجھ کر دل کی بات مجھ سے کہہ دو۔ وہ حادثہ جو تمہارے ساتھ گزرا۔ وہ دکھ جو تم نے جھیلا اور جس نے تمہیں محبتوں سے متنفر کر دیا ہے۔ دوستوں سے خوفزدہ کر دیا ہے۔ شاید اس طرح تمہارے دل کا بوجھ کم ہو جائے۔"

اور پھر میں نے سب کچھ کہہ دیا۔ شاید اب یہ بوجھ تنہا مجھ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔

"بہت کم عمری میں تم نے بہت بڑا دکھ سہا ہے۔ تمہارا رویہ بالکل نارمل ہے۔"

رضا نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میں تم سے یہ تو نہیں کہتا کہ تم ہماری محبتوں پر یقین کرو۔ لیکن وقت تمہیں خود بتا دے گا کہ سب چہرے ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

اُسے دفتر جانا تھا۔ اس لیے وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے اور میں پھر کھڑکی میں کھڑا ہوا ہوں اور لوگوں کو اپنی اپنی منزل کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں یہ سب لوگ اندر سے بھی اتنے ہی پُرسکون اور مطمئن ہیں جتنے باہر سے دکھائی دیتے ہیں۔ یا پھر۔ یا پھر میری طرح۔ مگر نہیں جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے۔ شاید کسی کے ساتھ نہیں ہوا ہو گا۔ بیتے ہوئے ماہ و سال ایک بار پھر میری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگے ہیں۔ اور اتنے سارے سالوں بعد میری آنکھوں کی خشک سطح گیلی ہو رہی ہے۔ اور میں کھڑکی سے سر ٹکائے رو رہا ہوں۔ وہ آنسو جو اٹھارہ سال کی عمر میں میری آنکھوں میں خشک ہو گئے تھے۔ آج سات سال بعد میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں اور روتے روتے میں نے اپنے آپ سے کہا ہے۔

"روحی نثار احمد میں نے تمہیں معاف کیا۔
تمہارے فریب اور دھوکے کو۔
وہ کھیل جو تم نے میرے ساتھ کھیلا۔
وہ زخم جو تم نے مجھے دیے، وہ ساری اذیت جو میں نے اٹھائی۔ سب میں نے تمہیں معاف کیا۔
اُس محبت کے عوض جو تم نے مجھے دی تھی۔
خواہ وہ فریب تھی۔ یا دھوکا۔
مگر جھوٹ ہی سہی تم نے میرے دکھوں کو شیئر کیا تھا۔
اور اس کے عوض میں نے تمہاری ساری زیادتیاں معاف کر دی ہیں۔ روحی نثار احمد۔" اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر سکون سا اتر آیا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ میں ابھی جا کر ماما کی گود میں سر رکھ دوں گا اور کہوں گا۔

"ماما میں بہت تھک گیا ہوں۔ مجھ سے اب اکیلے مزید چلا نہیں جاتا۔ ماما مجھے اپنی شفیق بانہوں میں چھپا لیجیے مجھے اپنا بیٹا بنا لیجیے ماما۔

مجھے امی جیسی پیاری لڑکی کی رفاقت اور ہمراہی کی ضرورت ہے۔"

اور مجھے یقین ہے ماما مجھے اپنی شفقت کے سائے میں چھپا لیں گی۔

اور رضا۔ وہ بہت مخلص اور ہمدرد لڑکا۔
میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہے گا۔

"علی! تم تو سچ مچ میرے بھائی ہو اور پھر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں دیر کیوں کی یار۔"

اور امی وہ پیاری سی دلکش لڑکی شرما کر بھاگ جائے گی۔ اور میں آواز دوں گا۔ "امی سنو بھئی آج تمہاری کافی پیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

اور میرے اندر سکون و اطمینان کی پھوار سی پڑنے لگی ہے۔ اور جلتا ہوا درد ماند پڑ گیا ہے۔ اور میں ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے جلدی جلدی تیار ہونے لگا ہوں۔

●